اردو افسانہ: ماضی و حال

اردو میں داستان کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کا مرہون منت ہے۔ بعد ازاں داستانوں کے خلاف بطور رد عمل اور کچھ انگریزی اثرات کے باعث اردو ناول وجود میں آیا۔ ناول میں پہلی دفعہ بے سروپا باتوں اور مافوق الفطرت عناصر کے بجائے زندگی کے حقائق کو پیش کیا جانے لگا۔ ناول کے ساتھ ہی مختصر افسانہ کا وجود بھی عمل میں آیا جو سبب تھا انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیات اور مغربی اثرات کا۔ افسانہ دراصل مشینی دور کی پیداوار ہے کہ اس دور میں انسان کے لیے داستانیں اور ناول پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔

افسانہ کی تعریف کے حوالے سے مختلف آراء سامنے آ رہی ہیں۔ اس لیے اس کی جامع تعریف مشکل ہے۔ تاہم ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ ایک خاص پس منظر میں کسی خاص یا عام واقعات یا تصور زندگی کے کسی پہلو کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔ افسانہ اختصار کا متقاضی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، وحدت تاثر اور اسلوب کی چاشنی بھی از حد ضروری ہے۔ ان سب اصول و ضوابط کے باوجود افسانے کا فن جامد و ساکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید افسانہ تجربات کا مرہون منت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک افسانہ نگار انہی قواعد و ضوابط کو افسانہ لکھتے وقت پیش نظر رکھے بلکہ وہ خود بھی تجربات کر سکتا ہے۔ ان تجربات کا انحصار افسانہ نگار کی ذہنی صلاحیتوں پر ہے کہ وہ کس نوعیت کی تخلیق پیش کرتا ہے۔

اردو افسانے کے آغاز کے حوالے سے اگرچہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے لیکن اردو افسانے کی ابتدا کا سہرا حقیقتاً منشی پریم چند ہی کے سر بندھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف تواتر سے افسانے لکھے بلکہ اس کے ارتقائی سفر میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ انہی کا دم تا کہ اردو افسانہ نئی تخلیق فضا اور ماحول سے آشنا ہوا۔ یہ پریم چند ہی ہیں جو اردو افسانے کو داستانی ماحول سے الگ کر کے زندگی کے قریب لائے۔ ان کے ہاں ہندوستانی معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے۔ اُن کے کردار اپنے گرد و پیش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں کسان، مزدور اور غریب طبقے کے گھرانوں اور اُن کے ماحول کا ذکر بہت باریک بینی سے کیا گیا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں ہندوستانی کسان، مزدور اور غربت کی چکی میں پستے ہوئے پریشان حال لوگوں کی عادات و اطوار اور رسم و رواج کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ پریم چند اپنے افسانوں کے ذریعے اخلاقی درس دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اُن کے کردار، محنت اور انسانی عظمت کے مختلف پہلوئوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی مدد سے معاشرتی برائیوں کی اصلاح کا کام بھی لیتے ہیں۔ پریم چند ایک باشعور اور بالغ ذہن ادیب کی حیثیت سے اپنے دور میں اٹھنے والی آزادی کی اُمنگ سے بھی لاتعلق نہیں رہتے۔ اس حوالے سے اُن کے افسانے 'آشیاں برباد' اور 'ڈائل کا قیدی' اُن کے بدلتے ہوئے رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں پریم چند ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے 1936ء میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہی انہوں نے افسانہ 'کفن' لکھا۔ تاہم وہ دیگر ترقی پسندوں کی طرح کسی خاص نظریے کا پرچار نہیں کرتے بلکہ اُن کی تحریروں میں مقصد زیر سطح ہی رہتا ہے۔

اردو افسانے کا ایک اور نمایاں نام کرشن چندر ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر مارکسیت پر یقین رکھنے والے افسانہ نگار ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ دیگر اشتراکی ادیبوں کی طرح ادب برائے زندگی اور حقیقت نگاری کے قائل ہیں لیکن اُن کے ہاں پائی جانے والی رومانیت اُن کے اشتراکی ذہن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک دلکش امتزاج کا سبب بنتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید، کرشن چندر طبعاً رومانی ضرور ہیں لیکن ان کی معروضیت گہرے سماجی شعور کی عکاس ہے۔ کرشن چندر سماج اور انسانی مسائل کو اہم موضوعات کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں وسیع تر مشاہدہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہ معمولی واقعات سے بھی افسانے تخلیق کر ڈالتے ہیں۔ اُن کے ہاں زندگی کا ربط اور بے ربطی پر دونوں کا اظہار افسانوں کی شکل میں ہوا ہے۔

کرشن چندر کا شمار اہم ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ زندگی کے حقائق اور مسائل بیان کرتے وقت بھی ترقی پسند نظریات کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ جہاں تک کرشن چندر کی حقیقت نگاری کا تعلق ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی کا بہت باریکی اور گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ انسان کی محرومیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے ہاں زندگی سانس لیتی ہوئی اور آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانے، ان داتا، گرجن کی ایک شام، بالکونی اور پیاسا وغیرہ اس کی عمدہ مثال ہیں۔ اُن کا اسلوب رومانیت سے گندھا ہوا ہے جو تلخ سے تلخ بات اور کریہہ سے کریہہ واقعہ کو بھی فطری رعنائی بخش کر قابل قبول بناتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ترقی پسند نظریات کے غلبے کی بنا پر اُن کے ہاں جذبے کی کمی ضرور محسوس ہوئی ہے۔ بحیثیت مجموعی کرشن چندر اردو افسانے کا ایک نمایاں نام ہے جس نے اردو افسانے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی دور کی ایک اور افسانہ نگار عصمت چغتائی ہیں جن کے اردو افسانے پر انگریزی افسانوی ادب کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مشرق کی مروجہ روایات اور نسوانیت سے آمادہ بغاوت ہے۔ عصمت کے ہاں جنس کے مسائل بہت شدومد سے زیر بحث آئے ہیں۔ اس حوالے سے 'چوٹیں' اور 'لحاف' اُن کی نمائندہ تحریریں ہیں۔ جس میں انہوں نے جنسی جذبے کو زندگی کی اہم ترین اور بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس جذبے کی تسکین کی خواہش عین فطرت ہے۔ عصمت چغتائی کے ابتدائی افسانوں میں نوجوانوں اور اُن کے مسائل کا تذکرہ بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے لیکن اُن کی یہ حقیقت نگاری توازن کے فقدان کی بنا پر زیادہ مؤثر نہیں ٹھہرتی بلکہ لذت پسندی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

اردو افسانے کے ابتدائی خدوخال نمایاں کرنے میں ایک اور افسانہ نگار کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خواجہ احمد عباس ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک رپورٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا مجموعی جائزہ لیں تو یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں لگتی۔ وہ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو زندگی کی تعمیر میں سماجی مسائل اور سیاسی الجھنوں کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اُن کا مشاہدہ اور تخلیقی قوت دونوں جاندار ہیں البتہ کہیں کہیں ترقی پسند نظریات کے غلبے کی بنا پر اُن کی حقیقت نگاری پر غیر فطری ہونے کا گماں ضرور گزرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے سردار جی، انتقام اور شکر اللہ وغیرہ کی مثال دی جاسکتی ہے لیکن

اس کے ساتھ ساتھ ان کے بعض افسانے نظریے اور جذبے کا خوبصورت امتزاج بھی ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا افسانہ 'پسماندگان' ایک نمایاں مثال ہے۔ جس میں وہ ایک بڑے افسانہ نگار کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

اردو افسانہ کی تاریخ میں ایک نام احمد علی کا بھی ہے جنہوں نے اردو افسانے کے پر سکون پانیوں میں اپنے مشترکہ افسانوی مجموعے 'انگارے' سے ارتعاش پیدا کیا۔ دسمبر 1932ء میں نو افسانوں اور ایک ڈرامے پر مشتمل مجموعہ 'انگارے' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں احمد علی کے ساتھ سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے بھی شامل تھے۔ ان افسانوں کے موضوعات اور لب ولہجہ اشتعال انگیزی کا باعث بنا۔ جس نے اس کتاب کو اردو افسانوی ادب میں نمایاں کر دیا۔ انتظار حسین 'انگارے' کے اسلوب اور موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ 'انگارے' نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانے میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

انگارے کے افسانوں سے بے شک اردو افسانے میں سنسنی خیزی اور اشتعال کی ایک لہر تو آئی لیکن اس نے اردو افسانے کے ارتقا میں بہت سے در وا بھی کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اردو افسانے کی بساط پر ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنہوں نے 'انگارے' کے اسلوب کو اپنا راہنما بنایا اور کچھ پرانے لکھنے والوں کے قلم سے بھی انقلابی افسانے تخلیق کروائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'انگارے' کے افسانوں نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی واقعوں میں ہلچل پیدا کی بلکہ ادبی اور فنی تصورات کی دنیا کو بھی اتھل پتھل کر دیا۔ ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر قمر انیس کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ 'دُلاری' اور 'انگارے' کی دوسری کہانیوں میں فن کا وہ نیا تصور تھا جس نے نہ صرف حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی جیسے نوجوان ادیبوں کو متاثر کیا بلکہ پریم چند ایسے کہنہ مشق ادیبوں کو بھی اپنے فن کی پرانی روش بدلنے اور 'کفن' اور 'بیوی' جیسے افسانے لکھنے پر اکسایا۔"

'انگارے' کی اشاعت نے احمد علی کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ احمد علی کے افسانوں نے اردو افسانے میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ 'انگارے' میں شامل ان کے افسانے، 'بادل نہیں آتے' اور 'مہاوٹوں کی ایک رات' مٹتی ہوئی تہذیب پر ایک جرأت مندانہ طنز کی علامت ہیں۔ انہوں نے یہ طنز نہایت بے باکی سے کیا ہے۔ گو ان کے ہاں اعتدال اور توازن کا فقدان ہے لیکن ان کے ہاں پائی جانے والی سنسنی خیزی، برصغیر میں پائی جانے والی ان دنوں کی سیاسی و سماجی کشمکش اور تحریکوں کی عکاس ہے۔

اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں مختلف افسانہ نگاروں نے رخت سفر باندھا۔ کچھ دو چار گام پر ہی ساتھ چھوڑ گئے اور کچھ تادیر شریک سفر رہے۔ ایسے ہی افسانہ نگاروں میں اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری اور احتشام حسین شامل ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی ناہمواری اور اتار چڑھاؤ بنیادی موضوع ہے۔ سیاسی کشمکش اور مختلف تحریکوں کے اثرات بھی ان کی تحریروں پر نمایاں ہیں۔ اختر حسین رائے پوری ٹیگور سے متاثر ہیں جبکہ علی سردار جعفری اور احتشام حسین ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس قافلے میں اختر انصاری اور حیات اللہ انصاری بھی شامل ہیں۔ اختر انصاری کے ہاں بورژوا سماج کے استبداد اور پرولتاری جماعت کی مظلومیت سے آویزش پیدا کی گئی ہے۔ فنی اعتبار سے اُن کے افسانے کمزور ہیں کیونکہ وہ مقصدیت کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے ہاں زمینی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ خاص طور پر سماجی اور معاشی بدحالی کے واقعات ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ اُن کا اسلوب اور موضوع توازن اور اعتدال کی مثال ہے۔ وہ انسانی کرب اور پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے واقعیت اور حقیقت نگاری کو اعتدال سے محروم نہیں ہونے دیتے۔